طرف اڑی جارہی ہو۔ اُسے اپنی ناک میں کھجلی۔ آنکھوں میں جلن اور سر میں چکر کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے ہی بھول جاتی اور بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتی۔ ایک بار گھر کی یاد آئی۔ رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سہیلیوں کی یاد آگئی ہنسنے لگی۔

دفعتاً رمانا تھ ایک پوٹلی لئے مسکراتا ہوا آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جالپا نے اُٹھ کر پوچھا۔ پوٹلی میں کیا ہے۔

بوجھ جاؤ تو جانوں۔

ہنسی کا گول گپا ہے۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"غلط۔"

"تو پریم کی پٹاری ہوگی۔"

رمانے کہا۔ ٹھیک آج میں تمہیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔

جالپا کھل اٹھی۔ رمانے بڑے شوق سے اُسے پھولوں کے زیور پہنانے شروع کئے۔ پھولوں کے نازک اور طراوت آمیز احساس سے جالپا کی تنِ نازک میں گدگدی سی ہونے لگی۔ انہیں پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اُٹھا۔

رمانے مسکرا کر کہا۔ کیا انعام دیتی ہو؟

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نشہ کے ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

رما کو اس وقت اپنی دغابازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پراعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ میرے بابوجی تمہیں دیکھ کر گئے۔ اور

اماں سے تمہاری تعریف کرنے لگے۔ تو میں سوچتی تھی، تم کیسے ہو گے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔

رما ناتھ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کچھ جواب نہ دیا۔

جا لپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ میری سہیلیاں تمہیں دیکھ کر بھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی، جب تم اندر گئے تھے تو اسی نے تمہیں پان کے بیڑے دیئے تھے۔ یاد ہے؟

رما نے کوئی جواب نہ دیا۔ جا لپا پھر بولی۔ اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بے چاری شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں، سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟

رما ناتھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا "مجھے یاد نہیں آتا۔"

اچھا اب کے چلو گے تو دکھا دوں گی۔" آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں۔"

رما نے سر جھکا کر کہا "آج تو فرصت نہیں ملی۔"

" جاؤ۔ میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لا دو گے؟"

رما ناتھ کا دل مسوس اٹھا۔ یہ غریب چند ہار کے لئے اس قدر بیتاب ہو رہی ہے اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا جا لپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے مستِ خواب تھی۔ رما آہستہ سے اٹھا، مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کر دیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا ہفتوں نظروں سے جا لپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہو گیا تھا۔ کمرے سے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ کہاں جاتے ہو۔ کیا سویرا ہو گیا؟

"ابھی تو بڑی رات ہے۔"

"تو تم بیٹھے کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا پانی پینے گیا تھا۔"

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور اُسے سُلا کر کہا۔ تم اس طرح مجھ پر ٹونا کرو گے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بسنتی سچ کہتی تھی۔ مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے

رمانا تھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا "کیا کروں۔ آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔" دونوں پھر لیٹے۔ ایک اُلفت میں متوالی۔ دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔

تین گھنٹے اور گذر گئے۔ دو اوشی کے چاند نے اپنا چراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا بازار بھی سو گیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اُٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی۔ تو گھبرا کر اٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکال لے۔

دیانا تھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انہیں آہستہ سے جگایا۔ انہوں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ کون؟

رما نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ میں ہوں۔ یہ صندوقچی اٹھا لایا۔ رکھ لیجئے۔

دیانا تھ صورت حال سمجھ گئے۔ رما نا تھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اٹھا لانے کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض چیلے کر رہا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علیحدہ رہنا چاہتا تھا۔ پوچھا اسے کیوں اٹھا لائے؟

"آپ نے ہی تو فرمایا تھا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"تو کیا پھر رکھ آؤں۔"

رمانا تھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔

اب کیا رکھ آؤ گے۔ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ وہی کام کرو گے جس میں رسوائی ہو۔ اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جا کر لیٹ رہو۔

برآمدے کے پیچھے دیا ناتھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیار کا ایک پرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رمانے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما چوں ہی چارپائی پر بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رمانے پوچھا کیا ہے۔ تم کیوں چونک پڑیں۔

جالپا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی۔

رمانے لیٹتے ہوئے کہا۔ سویرا ہو رہا ہے کیا خواب دیکھتی تھیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اٹھائے لئے جاتا ہو۔

رما کا دل اتنے زور زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ خون سرد ہو گیا۔ وہ زور سے چلا اٹھا، چور، چور!

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اٹھے۔ چور، چور!

جالپا گھبرا کر اٹھی۔ دوڑی ہوئی کمرے میں گئی۔ ایک جھٹکے میں الماری کھولی، صندوقچی

وہاں موجود نہ تھی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(۸)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صراف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔ صراف کے پندرہ سو روپے آتے تھے۔ مگر وہ صرف پندرہ سو روپیہ کے زیور لے کر راضی نہ ہوا۔ بکے ہوئے زیوروں کو وہ بٹے پر ہی لے سکتا تھا۔ بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے۔ جاکر ٹاپ دیئے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ ان چیزوں کا تو سودا ہو چکا تھا۔ اس نے کچھ ایسے "تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بے چارے کو ہاں ہاں کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔ دفتر کا بابو شاطر دوکاندار سے کیا جیت پاتا۔ پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے۔ اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے۔ اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے کئی دن آپس میں بول چال بند رہی۔ مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔ پولیس کو خبر ہو جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا۔ مفت کی زحمت ہوگی۔

جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی۔ اتنی شاید دنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی۔ اور اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی۔ اس وقت اس کے لئے سونے کے چوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اسکو گود میں کھلانے لگتی تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ تیرا دولہا تیرے لئے اچھے گہنے لائے گا۔ تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔

جالپا پوچھتی۔ چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی۔

دادی کہتی سونے کے ہوں گے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے

تو تم اٹھا کر اس کے منہ پر پٹک دینا۔

مانکی چھیڑ کر کہتی۔ چاندی کے تولائے گا ہی! سونے کے اُسے کہاں ملے جاتے ہیں۔

جالپا رونے لگتی۔ اس بوڑھی دادی۔ مانکی۔ گھر کی مہریاں۔ پڑوسنیں اور دیندیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ زوال سرچشمہ تھا۔

لڑکی جب ذرا اور سیانی ہوئی۔ تو گڑیوں کے بیاہ رچانے لگی۔ لڑکے کی طرف سے چڑھاوے آتے۔ وہ دلہن کو گہنے پہناتی اور ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتی۔ کبھی کبھی دلہن گڑیا اپنے دولہا گڈے سے زیوروں کے لئے روٹھ جاتی۔ گڈا بے چارہ کہیں نہ کہیں سے زیور لا کر دلہن کو خوش کرتا تھا۔ انہیں دنوں باطی نے اسے وہ چندن ہار دیا۔ جو اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

جب ذرا بڑی ہوئی۔ تو بڑی بوڑھیوں میں بیٹھ کر زیوروں کے چرچے سننے لگی۔ عورتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ کس نے کون کون سے زیور بنوائے کتنا صرف ہوا؟ بھوس ہیں یا پورے؟ جڑاؤ ہیں یا سادے؟ سونے کے ہیں یا چاندی کے انہیں اہم مسائل پر ہمیشہ تنقید و تبصرے ہوتے رہتے تھے۔ کوئی دوسرا تذکرہ اتنا دلچسپ اتنا مزے دار ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس مرقع دنیا میں پلی ہوئی جالپا کی یہ زیور پسندی بالکل فطری تھی مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ پر ابھی اس کا زخم تازہ ہے۔ برائے نام کچھ کھا پی لیتی ہے۔ برائے نام ہنس بول لیتی ہے۔ دن بھر چارپائی پر پڑی ہوئی آسمان کی طرف تاکتی رہتی ہے۔ سارا گھر سمجھا کر ہار گیا۔ پڑوسنیں سمجھا کر ہار گئیں۔ دیندیال آکر سمجھا گئے۔ پر جالپا کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اسے اب گھر میں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ رما سے بھی کھچی ہوئی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے سارا گھر اس سے بے اعتنائی کر رہا ہے۔ سب کے سب اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ جب ان کے پاس اتنی دولت ہے تو پھر اس کے گہنوں کو کیوں نہیں

بنوا دیتے۔ جس سے ہم سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اسی پر سب سے زیادہ ناراض بھی ہوتے ہیں جالپا کو سب سے زیادہ غصہ رمانا تھا پر تھا۔ اگر یہ اپنے ماں باپ سے زور دے کر کہتے تو کوئی ان کی بات نہ ٹال سکتا۔ مگر یہ کچھ کہیں بھی ان کے منہ میں تو دہی جمایا ہوا ہے۔ مجھ سے محبت ہوتی تو یوں بے فکر نہ بیٹھے رہتے۔ جب تک ساری چیزیں نہ بنوا لیتے رات کو نیند نہ آتی۔ آخر جائیں گے تو اپنی ہی طرف! میں کون ہوں۔

وہ رما سے صرف کبیدہ خاطر ہی نہ رہتی۔ وہ اس کی دلجوئی کرتا تو دو چار جلی کٹی سنا دیتی۔ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ غریب اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلا جاتا تھا اگر وہ جانتا کہ اس کی ڈینگوں کا یہ نتیجہ ہوگا۔ تو زبان پر مہر لگا لیتا۔ یہ غم اس کے لئے سوہان روح ہو رہا تھا۔ کہاں صبح سے شام تک ہنسی قہقہہ، سیر سپاٹے میں کٹتے تھے۔ کہاں اب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ ساری مستی غائب ہو گئی۔ تین ہزار کے زیور کیسے بنیں گے، اگر نوکر بھی ہوا تو ایسا کون سا بڑا عہدہ مل جائے گا۔ تین ہزار تو شاید تین پشتوں میں بھی نہ جمع ہوں۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ جلد سے جلد بے حساب دولت کا مالک ہو جائے۔ کہیں اس کے نام کوئی لاٹری نکل آتی۔ تو پھر تو وہ جالپا کو زیوروں سے مڑھ دیتا۔ سب سے پہلے چندن ہار بنواتا۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا۔ اگر آج اسے جعلی نوٹ بنانا آجاتا تو ضرور بنا کر چلا جاتا۔

ایک دن وہ شام تک نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ شطرنج کی بدولت اس کے کتنے ہی اچھے اچھے آدمیوں سے یارانہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ شرم و لحاظ کے مارے کسی سے اظہار نہ کرتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں جب تک وہ کسی سے اظہار حال نہ کرتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں جب تک وہ کسی کے سامنے مدد کے لئے جال نہیں پھیلاتا۔ یہ آن ٹوٹی تو پھر کوئی بات نہ پوچھے گا کوئی ایسا نکتہ اس آدمی میں نہ نظر آتا تھا جو ساری کیفیت بتانے سے تاڑ جائے اور

اُسے کوئی معقول جگہ دلوادے۔ آج وہ بہت رنجیدہ تھا۔ دوستوں پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ ایک ایک کو پھٹکارے اور آئیں تو دروازے سے ہی دھتکارے۔ مگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس معاملے میں دوستوں کا اتنا قصور نہ تھا۔ جتنا منبواس کا کوئی ایسا دوست نہ تھا۔ جس سے اس نے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی ہوں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مگر گھر کی اصلی کیفیت کو وہ بدنامی کے داغ کی طرح چھپاتا رہا۔ اور اب وہ کسی سے اپنا دردِ دل نہیں کہہ سکتا۔ گھر میں آکر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

باگیشری نے پانی لاکر رکھ دیا۔ اور پوچھا۔ آج تم دن بھر کہاں رہے بیٹا؟ ہاتھ منہ دھوڈالو۔

رمانے لوٹا اٹھایا ہی تھا کہ جالپا نے آکر تند لہجے میں کہا "مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ اسی وقت۔"

رمانے لوٹا رکھ دیا۔ اور اس کی طرف اس طرح تاکنے لگا۔ گویا اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

باگیشری بولی۔ کیسی بات کہتی ہو بہو۔ بھلا اس طرح کہیں بہو بیٹیاں بدا ہوتی ہیں۔

جالپا نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ میں ان بہو بیٹیوں میں نہیں ہوں۔ میرا جس وقت جی چاہے گا جاؤں گی۔ جس وقت جی چاہے گا آؤں گی۔ جب یہاں کوئی میری بات نہیں پوچھتا تو میں بھی کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ میں چڑیا نہیں ہوں جس کا پنجرہ اور دانہ پانی رکھ کر بند کر دیا جائے۔ میں بھی آدمی ہوں۔ اب اس گھر میں ایک لمحہ بھر نہ رہوں گی۔ اگر کوئی میرے ساتھ نہ جائے گا۔ تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ راہ میں کوئی بھیڑیا نہیں بیٹھا ہے جو مجھے اٹھالے جائے گا۔

رمانے پوچھا۔ آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کیا بات ہے؟

بات کچھ نہیں ہوئی۔ اپنا جی ہے۔ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔

بھلا اس طرح جاؤ گی تو تمہارے گھر والے کیا کہیں گے۔ یہ تو سوچو۔

یہ سب سوچ چکی ہوں اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میں جا کر اپنا اسباب باندھتی ہوں اور اسی گاڑی سے جاؤں گی۔

یہ کہہ کر جالپا اوپر چلی گئی۔ رما بھی پیچھے پیچھے یہ سوچتا ہوا چلا کہ اس کا غصہ کیسے ٹھنڈا کروں۔

جالپا اپنے کمرے میں جا کر بستر باندھ رہی تھی کہ رما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ تمہیں میری قسم جو اس وقت جانے کا نام لو۔

جالپا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ تمہاری قسم کی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور پھر بستر لپیٹنے لگی۔ رما کھسیانا سا ہو کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ جالپا نے بستر بند سے بستر کو باندھا سا اور اپنا صندوق صاف کرنے لگی۔ مگر اس میں اب وہ پہلے کی سی تیزی نہ تھی۔ صندوق کو بار بار بند کرتی اور کھولتی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی صرف چھت پر رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔

آخر وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ تم نے مجھے قسم کیوں دلائی۔

رما کے دل میں امید کی گدگدی پیدا ہوئی۔ بولا۔ اس کے سوا تمہیں روکنے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا۔

کیا تم چاہتے ہو۔ میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟

تم ایسے منحوس الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ میں تو چلنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر کم سے کم ان لوگوں سے تو پوچھ لوں۔

بجھتی ہوئی آگ میں تیل پڑ گیا۔ جالپا تڑخ ہو کر بولی۔ وہ میرے کون ہوتے ہیں کہ میں ان سے پوچھوں۔

رمانے پوچھا۔ کوئی نہیں ہوتے ؟

جالپانے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتے تو میری طرف سے یوں دل نہ موٹا کرتے۔ اس قید میں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ کسی سے بات چیت۔ یہ صورت تو مجھ سے نہیں دکھائی جاتی۔ آخر دو لڑکے اور بھی تو ہیں ان کے لئے بھی تو کچھ جوڑیں گے۔

رما کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا پھر موقع ملا۔ بولا۔ شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے نہیں تو ڈھائی تین ہزار ان کے لئے کیا بڑی بات تھی۔

" مگر ہیں مکھی چوس پرلے درجے کے۔"

" مکھی چوس نہ ہوتے تو اتنی دولت کہاں سے آتی۔"

" مجھے تو کسی کی پرواہ نہیں ہے جی۔ ہمارے گھر کس بات کی کمی ہے۔ جب تمہاری نوکری لگ جائے تب مجھے بلا لینا۔"

" تلاش کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہے رہی ہے۔ ذرا اچھی جگہ چاہتا ہوں۔"

" میں ان لوگوں کا رخ سمجھتی ہوں۔ میں بھی یہاں اب دعوے کے ساتھ رہوں گی۔ کسی سے ذکر کیا ؟"

" شرم آتی ہے کسی سے کہتے ہوئے۔"

" اس میں شرم کی کونسی بات ہے۔ کہتے شرم آتی ہو تو رقعہ لکھ دو۔"

رما اچھل پڑا۔ کتنی آسان تدبیر تھی۔ اور ابھی تک یہ سیدھی سی بات اسے سوجھی نہ تھی۔ بولا۔ ہاں! یہ تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ کل ضرور لکھونگا۔

جالپا بولی۔" واہ! تم آج ہی تھوڑی لوٹ آؤ گے۔"

رما بولا۔ کیا تم پرسوں چلی جاؤ گی؟ تو جب مجھے نوکری مل چکی اور میں خط لکھ چکا۔ تمہارے

فراق میں بیٹھ کر روؤں گا کہ نوکری ڈھونڈوں گا۔ نہیں اس وقت جانے کا خیال چھوڑو۔ نہیں سچ کہتا ہوں میں، کہیں بھاگ جاؤں گا۔ گھر کا سال دیکھ چکا تھا۔ تمہارے سوا اب اور کون بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے لئے یہاں پڑا رہوں۔ ہٹو تو ذرا میں بستر کھول دوں۔"

جالپا نے بستر پر سے ذرا کھسک کر کہا "میں بہت جلد چلی آؤں گی۔ تم آگئے اور میں آئی۔"

رما بستر کھولتا ہوا بولا "جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ اس دھوکے میں میں نہیں آتا۔"

جالپا نے احسان جتلاتے ہوئے کہا "تم نے میرا بندھا بستر کھول دیا۔ نہیں تو آج کتنے مزے سے گھر پہنچ جاتی۔ میں نے آج پکا ارادہ کر لیا تھا۔"

رما نے پان کھایا اور اپنے کمرے میں آکر دوستوں کو خط لکھنے لگا۔

(۹)

رما ناتھ کے شناساؤں میں ایک رمیش بابو میونسپل بورڈ کے ہیڈ کلرک تھے۔ عمر تو چالیس سے اوپر تھی۔ مگر تھے بڑے شوقین! شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تو سویرا کر دیتے۔ دفتر کی بھی یاد نہ رہتی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ جوانی میں بیوی مر گئی تھی۔ دوسری شادی نہیں کی۔ اس تجرد کی زندگی میں تفریحی مشاغل کے سوا دلچسپی کا اور کیا سامان تھا۔ رما سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ وہاں اور کون ایسا نٹھلا تھا جو رات رات بھر ان سے شطرنج کھیلتا۔ کئی دن سے بچارے بہت بے قرار ہو رہے تھے۔ نہ رما آیا اور نہ شطرنج کی کوئی بازی ہوئی۔ اخبار کہاں تک پڑھتے سو جاب رما میرے پاس کیوں آنے لگا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اسے بلوائیں، مگر یہ سوچ کر کہ وہ کیوں آنے لگا۔ رہ گئے کہاں جائیں۔ سو چا سنیما ہی دیکھ آئیں۔ کسی طرح دن تو کٹے۔ سنیما سے انہیں بہت رغبت نہ تھی۔ مگر اس وقت انہیں سنیما کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ کپڑے پہنے اور جانا ہی چاہتے تھے کہ رما نے کمرے

میں قدم رکھا۔

رمیش اُسے دیکھتے ہی گیند کی طرح لڑھک کر دروازے پر جا پہنچے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ آؤ جی آؤ۔ تم اس بڈھے کو بھول ہی گئے۔ ہاں بھائی اب کیوں آؤ گے! معشوق کی رسیلی باتوں کا مزا یہاں کہاں۔ چوری کا کچھ پتہ چلا۔؟

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا "کچھ بھی نہیں۔"

رمیش بابو نے چھوٹی میز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ بہت اچھا ہوا تم نے میں رپٹ نہیں لکھائی۔ نہیں سو دو سو کے ماتھے اور جاتی۔ دلہن کو تو بہت رنج ہوا ہوگا۔

"کچھ پوچھئے مت۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ بابو جی ہنستے ہی نہیں۔"

بابو جی کے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے ہوں گے تو ابھی دو بچے بھی تو سامنے ہیں۔ نوکری کا بھروسہ ہی کیا۔

میں تو مصیبت میں پھنس گیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ چین سے زندگی کٹتی تھی۔ نہیں تو بیٹھے بٹھائے اس جنجال میں پھنس گئے۔ بتلائیے ہے کہیں نوکری چاکری کا سہارا۔

رمیش نے طاق پر سے مہرے اور بساط اتارتے ہوئے کہا "آؤ ایک بازی ہو جائے۔ پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو۔ اتنا آسان نہیں ہے

رما نے منہ پھیر کر کہا۔ میرا تو اس وقت کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت تو یہی سر پر سوار ہے۔

رمیش بابو شطرنج کے مہرے بچھاتے ہوئے بولے۔ آؤ بیٹھو ایک بازی تو کھیل لو۔ پھر سوچیں کیا ہو سکتا ہے۔

ذرا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں جانتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے تو

شادی کے قریب ہی نہ جاتا۔

"دو چار چالیں چلو۔ تو آپ ہی جی لگ جائے گا۔ ذرا عقل کی گانٹھ کھلے۔"

بازی شروع ہوئی۔ کئی معمولی چالوں کے بعد رمیش نے رما کا رخ پلٹ لیا رما نے میز پہ ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "اُف کیا غلطی ہوئی ہے؟"

رمیش بابو کی آنکھوں میں نشہ کی سی سرخی پیدا ہونے لگی، شطرنج ان کے لئے شراب سے کم سرور انگیز نہ تھا۔ بولے۔ بہنی تو اچھی ہوئی۔ تمہارے لئے میں ایک تدبیر سوچ رہا ہوں۔ میرے ہی دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔ مگر مشاہرہ بہت کم ہے۔ محض تیس روپے وہ خضابی ڈاڑھی والے خانصاحب نہیں ہیں۔ ان سے کام نہیں چلتا۔ سوچا تھا جب تک کسی طرح کام چلا چلے۔ پڑا رہنے دوں۔ بال بچے والے آدمی ہیں۔ اس بیکاری کے زمانے میں کہاں مارے مارے پھریں گے۔ مگر وہ خود ہی نوکری سے بیزار ہو رہے ہیں۔ تمہارے لائق وہ جگہ نہیں ہے۔ مگر چاہو تو فی الحال کر لو۔

یہ کہتے کہتے رما کا فیلا مار لیا۔

رما نے فیلے کو پھر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ آپ مجھے باتوں میں لگا کر میرے مہرے اڑاتے جاتے ہیں۔ اس کی سند نہیں لائیے میرا فیلا۔

"دیکھو بھائی بے ایمانی مت کرو۔ میں نے تمہارا فیلا زبردستی تو نہیں اُٹھا لیا۔ ہاں تو تمہیں وہ جگہ منظور ہے۔"

"تنخواہ تو تیس ہی ہیں۔"

ہاں تنخواہ تو کم ہے۔ مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کر لو۔ جگہ آمدنی کی ہے۔ خانصاحب نے تو اسی جگہ رہتے ہوئے لڑکوں کو ایم اے، ایل۔ بی کرا لیا۔ لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔ ہاں ذرا سمجھ بوجھ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

رما نے بے غرضی جتلا کر کہا۔ "آمدنی کی مجھے پرواہ نہیں۔ رشوت کوئی اچھی چیز تو نہیں۔"

رمیش بابو نے رما کی آنکھ بچا کر ایک مہرے کو آگے بڑھا کر کہا۔ بہت خراب مگر عیالدار آدمی کیا کرے۔ میں اکیلا آدمی ہوں۔ میرے لئے ڈیڑھ سو کافی ہیں۔ لیکن جس گھر میں بہت سے آدمی ہوں۔ لڑکوں کی تعلیم ہو۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوں۔ اس کے لئے رشوت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جب تک چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھلمنسی کے ساتھ نباہ کر سکیں۔ تب تک رشوت بند نہیں ہو سکتی۔

رما کا فرزیں پٹے گیا۔ رمیش بابو نے زور سے قہقہہ مارا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ "اگر آپ چپ چاپ کھیلئے تو کھیلئے۔ ورنہ میں تو جاتا ہوں۔ مجھے باتوں میں لگا کر سارے مہرے اڑا لئے۔"

رمیش نے دب کر کہا۔ "اچھا صاحب اب بولوں تو زبان پکڑ لیجئے۔ یہ لیجئے شہ۔ تو تم کل عرضی پیش کر دو۔ مگر جس دن جگہ ملے گی میرے ساتھ رات بھر کھیلنا پڑے گا۔"

"آپ تو دو ہی باتوں میں رونے لگتے ہیں۔"

"ابھی وہ دن گئے۔ جب آپ مجھے مات کر دیا کرتے تھے۔ ادھر میں نے ایک منتر جگایا ہے۔ کیا مجال کوئی مات دے سکے۔ پھر شہ۔"

"جی تو یہی چاہتا ہے کہ دوسری مات دے کر جاؤں۔ مگر دیر ہو گئی۔"

"دیر کیا ہو گی؟ ابھی تو کل نو بجے ہیں۔ کھیل لو۔ دل کا ارمان نکل جائے۔ یہ شہ۔ اور مات۔"

"اچھا کل ہی رہی! کل للکار کر پانچ مات نہ دی ہوں تو کہئے گا۔"

"اجی جاؤ بھی۔ تم مجھے کیا مات دو گے۔ بہت ہو تو ابھی سہی۔"

"اچھا آیئے آپ بھی کیا کہیں گے۔ مگر پانچ بازیوں سے کم نہ کھیلوں گا۔"

"پانچ نہیں تم دس کھیلو جی۔ رات تو اپنی ہے تو چلو پھر کھانا کھالیں۔ تب اطمینان سے بیٹھیں۔ تمہارے گھر کہلائے دیتا ہوں کہ آج یہیں سوئیں گے۔ انتظار نہ کریں۔"

دونوں نے کھانا کھایا۔ اور شطرنج پر بیٹھے۔ پہلی بازی میں گیارہ بج گئے۔ رمیش کی جیت رہی۔ دوسری بازی بھی انہیں کے ہاتھ رہی۔ تیسری بازی ختم ہوئی تو دو بج گئے تھے۔ رما نے آنکھیں مل کر کہا۔ اب تو مجھے نیند آرہی ہے۔

رمیش نے کہا۔ تو منہ دھو ڈالو۔ برف رکھی ہوئی ہے۔ پانچ بازیاں کھیلے بغیر سونے نہ دوں گا۔

رمیش بابو کو یقین ہو رہا تھا۔ کہ آج میرا نیر اقبال اوج پر ہے۔ نہیں تو رما کو متواتر تین مات دینا آسان نہ تھا۔ مگر جب چوتھی ہار گئے تو یقین جاتا رہا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں متواتر ہارتا جاؤں۔ بولے اب تو سونا چاہیئے۔

"کیوں پانچ بازیاں پوری نہ کر لیجئے۔"

"کیا فائدہ کل دفتر بھی تو جانا ہے۔"

رما نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ دونوں آدمی سوئے۔

رمایوں بھی آٹھ بجے سے پہلے نہ اٹھتا تھا۔ پھر آج تو تین بجے سویا تھا۔ آج تو اسے دس بجے تک سونے کا حق تھا۔ مگر رمیش بابو حسب معمول پانچ اٹھے۔ نہایا دھویا کی گھومنے گئے۔ اور آٹھ بجے لوٹ آئے۔ رما اس وقت تک سوتا ہی رہا۔ آخر جب ساڑھے نو بج گئے تو انہوں نے اسے جگایا۔

رما نے بگڑ کر کہا۔ ناحق جگایا۔ کیسے مزے کی نیند آرہی تھی۔

"اجی دفتر جانا ہے تم کو یا نہیں؟"

"آپ دے دیجئے گا۔"

"اور جو کہیں صاحب نے بلایا تو میں چلا جاؤں گا۔"

"اونہہ! جو چاہے کیجئے گا۔ میں تو سوتا ہوں۔"

رما پھر لیٹ گیا۔ رمیش نے کھانا کھایا۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلنے کو تیار ہوئے اس وقت رما بک بکا کر اٹھا اور بولا۔ میں بھی چلوں گا۔

"ارے منہ تو دھو لو بھلے آدمی۔"

"آپ تو چلے جا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک رُک سکتا ہوں تیار ہو جاؤ!"

رما نے ایک منٹ میں منہ دھویا۔ پانچ منٹ میں کھانا کھایا اور جھٹ پٹ رمیش کے ساتھ دفتر چلا۔

راستے میں رمیش نے مسکرا کر کہا۔ گھر کیا بہانہ کرو گے۔ کچھ سوچ رکھا ہے۔

"کہہ دونگا۔ رمیش بابو نے آنے نہیں دیا۔"

"مجھے گالیاں دلواؤ گے اور کیا۔"

"مجھے عرضی لے کر صاحب کے پاس تو نہ جانا پڑے گا۔"

"اور کیا تم سمجھتے ہو گھر بیٹھے جگہ مل جائے گی؟ مہینوں دوڑنا پڑے گا۔"

"تو میں ایسی نوکری سے باز آیا۔ مجھے تو عرضی لے کر جاتے شرم آتی ہے۔ پہلے میں کلرکوں کو ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر وہی بلا میرے سر پڑی۔"

"اجی پہلے سب یوں ہی گھبراتے ہیں۔ جب میں نوکر ہوا۔ تو تمہاری عمر تھی۔ جس دن میری پیشی ہونے والی تھی میں ایسا گھبرایا ہوا تھا جیسے پھانسی پانے جا رہا ہوں۔"

"آپ کچے تو بیس بائیس سال تو نوکری کرتے ہوئے ہوں گے۔"

"پورے پچیس سال ہو گئے صاحب! بیس سال تو بیوی کے انتقال کو ہو گئے۔"
"آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ تب تو آپ کی عمر پچاس سے زیادہ
نہ ہو گی۔"
رمیش نے حسرت ناک تبسم کے ساتھ کہا۔ محلوں کا سکھ بھوگنے کے بعد جھونپڑا
کیسے اچھا لگتا ہے بھائی۔ محبت سے روح کو دائمی سکون ہو جاتا ہے۔ تم میری
حالت سے واقف ہو۔ اب تو بوڑھا ہوا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔
اس فرقت نصیب زندگی میں کبھی میری آنکھوں نے کسی حسینہ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی۔
کئی بار شادی کے لئے لوگوں نے گھیرا بھی۔ لیکن کبھی خواہش ہی نہ ہوئی۔ اس محبت کی شیریں
یادگاروں سے میرے لئے مسرت کے سارے سامان موجود ہیں۔
یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی دفتر پہونچ گئے۔

(۱۰)

رما دفتر سے گھر پہنچا۔ تو چار بج گئے تھے۔ وہ دفتر ہی میں تھا کہ آسمان پر بادل
گھر آئے۔ پانی آیا ہی چاہتا تھا۔ پر رما کو گھر پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ وہاں رک نہ
سکا۔ احاطہ کے باہر بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ زور کی بارش ہونے لگی۔ اساڑھ کا پہلا پانی
تھا۔ ایک لمحہ میں وہ لت پت ہو گیا۔ پھر بھی وہ کہیں ٹھہرا نہیں۔ کامیابی کی خوشخبری
کی مسرت میں اس ڈونگرے کی کیا پرواہ کر سکتا تھا۔ اس نے دل میں حساب لگا لیا تھا
کہ کتنی ماہوار بچت ہو جانے سے وہ جالپا کے لئے جلد سے جلد چندن ہار بنوا سکے گا۔
اگر پچاس ساٹھ روپے مہینہ بھی بچ جائیں تو پانچ سال میں جالپا زیوروں سے
لد جائے گی۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بھی نہ اتارے۔ لت پت جالپا کے کمرے
میں پہنچ گیا۔

جالپا نے پوچھا "یہ بھیگ کہاں گئے۔ اور رات کہاں غائب تھے۔"
رما ناتھ نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ نوکری کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت دفتر سے چلا آتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ مل گئی ہے۔
جالپا نے کھل کر پوچھا "سچ! کتنے کی جگہ ہے!"
رما کو صحیح بتلانے میں تامل ہوا۔ تیس کی نوکری بتانا کسر شان تھی۔ بولا۔ ابھی تو چالیس ملیں گے۔ مگر ترقی جلد ہو گی۔ جگہ آمدنی کی ہے۔
جالپا نے کسی بڑے عہدے کی امید کر رکھی تھی۔ بولی "چالیس میں کیا ہوگا؟ بھلا ساٹھ ستر تو ہوتے۔"
رما۔ مل تو سکتی تھی سو روپیہ کی بلی۔ مگر یہاں رعب ہے اور بالائی آمدنی کی گنجائش بھی کافی ہے۔
جالپا نے سادگی سے پوچھا۔ تو تم رشوت لو گے۔ غریبوں سے گھوس لو گے۔
رما نے ہنس کر کہا۔ نہیں جی۔ وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ غریبوں کا گلا کاٹنا پڑے بڑے بڑے مہاجنوں سے سابقہ ہوگا اور وہ خوشی سے دیں گے۔
جالپا کو اطمینان ہو گیا۔ بولی۔ تب ٹھیک ہے۔ غریبوں کا کام یوں ہی کر دینا۔
"ہاں! ایسا تو کروں گا ہی۔"
"جا کر اماں جی سے تو کہہ آؤ۔ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اب معلوم ہوگا۔ یہاں میں بھی کچھ ہوں۔"
"ہاں جاتا ہوں۔ مگر ان سے تو میں یہیں ہی بتاؤں گا۔"
جالپا خوش ہو کر بولی۔ اور کیا۔ اور اوپر کی آمدنی کا تو ذکر کرنا فضول ہے
اتنے میں ڈاکئے نے پکارا۔ رما نے دروازے پر جا کر دیکھا تو ان کے

نام کا ایک پارسل تھا۔ منشی دیندیال نے بھیجا تھا۔ لے کر خوش خوش گھر میں آئے اور چٹ پٹ قینچی نکال کر پارسل کھولا۔ اس کے اندر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں ایک چندن ہار رکھا ہوا تھا۔ رما نے خوش ہو کر کہا۔ یہ تو اچھا شگون ہے۔

جالپا نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ اماں جی کو یہ کیا سوجھی۔ یہ تو انہیں کا ہار ہے ابھی ڈاک کا وقت ہو تو اسے لوٹا دو۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں لوٹانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ناراض نہ ہوں گے۔

جالپا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ میری بلا سے! میں ان کی عنایت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ آج اتنے دنوں کے بعد انہیں یہ خیال آیا ہے۔ ان کی چیز انہیں مبارک ہو۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تم خیریت سے رہو گے تو مجھے بہت زیور ملیں گے۔

رما نے تسکین دے کر کہا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اس وقت ہار رکھ لو۔ سوچو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ اگر رخصتی کے وقت نہ دیا تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ یہ بھی غائب ہو جاتا۔

"میں اسے لوں گی نہیں۔ یہ طے ہے۔"

"آخر کیوں؟"

جالپا نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ اسی لئے کہ اماں نے اسے خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اسے بھیجتے وقت وہ روئی ہوں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اسے واپس پا کر انہیں سچی خوشی ہوگی۔ دینے والے کا دل دیکھا جاتا ہے۔ خوشی سے اگر وہ مجھے ایک چھلا بھی دیں تو دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لوں۔ جب دل پر جبر کر کے دنیا کی لاج سے دیا تو کیا دیا۔ میں کسی کی خیرات نہ لوں گی۔ چاہے وہ

اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔

جالپا کو ماں کی طرف سے اتنا بدظن دیکھ کر اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بدگمانی دلیل اور ثبوت کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس نے ہار اٹھا لیا۔ اور بولا۔ ذرا لوگوں کو تو دکھا دوں۔ کم سے کم ان سے پوچھ تو لینا چاہیئے۔

جالپا نے ہار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی۔ میں کسی سے کچھ نہیں پوچھنا چاہتی۔ میری مرضی ہے لوٹا یا واپس کر دوں۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ؟"

اس نے ہار کو اسی ڈبیا میں رکھ دیا۔ اور اس پر کپڑا لپیٹ کر سینے لگی۔ رما نے ایک بار پھر ڈرتے ہوئے کہا۔ ایسی جلدی کیا ہے ؟ دس پانچ دن میں لوٹا دینا۔ ان لوگوں کی بھی خاطر ہو جائے گی۔

جالپا نے بے رخی سے کہا۔ جب تک میں اسے لوٹا نہ دوں گی۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

ایک لمحہ میں پارسل تیار ہو گیا۔ اور رما اسے لئے متفکرانہ انداز سے نیچے اترا۔ گھڑی میں چار بجے تھے۔

(۱۱)

منشی دیا ناتھ کو جب رما کے نوکر ہونے کی خبر ملی۔ تو بہت خوش ہوئے۔ شادی ہوتے ہی وہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا۔ اس کی انہیں امید نہ تھی۔ بولے جگہ تو اچھی ہے۔ ایمان داری سے کام کرو گے تو اچھی جگہ پر پہنچ جاؤ گے۔ میری نصیحت ہے کہ پرائے پیسے کو حرام سمجھنا۔

رما کے جی میں تو آیا کہ صاف کہہ دے کہ آپ اپنی نصیحت اپنے ہی لئے رکھیں۔ یہ میرے موافق نہیں ہے۔ مگر اتنا بے حیا نہ تھا۔